جامعہ مدنیہ لاہور کا ترجمان

رجب ۱۴۳۲ھ / جون 2011ء

جامعہ مدنیہ کریم پارک راوی روڈ لاہور

دربار مصطفیٰ ﷺ

دل کھنچ رہا ہے جانبِ دربارِ مصطفیٰ ﷺ
ہم بے نوا ہیں طالبِ ، دیدارِ مصطفیٰ ﷺ

ڈھلنے لگی ہے سورۂ وَالّیل میں صَبا
کُھلنے لگے ہیں گیسوئے خم دارِ مصطفیٰ ﷺ

مینا ' ذرا سنبھل کہ ادب کا مقام ہے
آتے ہیں میکدہ میں قدح خوارِ مصطفیٰ ﷺ

غارِ حرا سے کرب و بلا کے مقام تک
دیدہ وروں پہ فاش ہیں اسرارِ مصطفیٰ ﷺ

قرآں کی آیتوں میں سراپا ڈھلا ہوا
اپنی دلیل آپ ہیں آثارِ مصطفیٰ ﷺ

سجدوں کی چاندنی سے جبینیں نکھر گئیں
آنکھوں میں بس گئے درو دیوارِ مصطفیٰ ﷺ

شورش بہ فیض خواجۂ کونین دیکھ لوں
جی چاہتا ہے کوچہ و بازارِ مصطفیٰ ﷺ

شورش کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ

(کلیات شورش، ص:۵۹۳)

علمی دینی اور اصلاحی مجلہ

ماہنامہ

لاہور

جلد نمبر: 3	رجب ۱۴۳۲ھ / جون 2011ء	شمارہ نمبر: 12

نگران

حضرت اقدس مولانا **سید رشید میاں** دامت برکاتہم

مدیر

مفتی محمد سعید خان

رابطہ نمبر
- 0333-8383337
- 0333-8383336

E.Mail: alnadwa@seerat.net
www.seerat.net

زرِ تعاون

فی شمارہ: 30 روپے، ششماہی: 150 روپے، سالانہ: 300 روپے

بیرون ملک

امریکہ، تھائی لینڈ، جنوبی افریقہ
ویسٹ انڈیز، ناروے وغیرہ 30 امریکی ڈالر
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط
بحرین، ایران، عمان، انڈیا وغیرہ 25 امریکی ڈالر
بنگلہ دیش 20 امریکی ڈالر

اکاؤنٹ نمبر: 0060-0081-002374-01-9
الحبیب بینک پاکستان

پتہ برائے خط و کتابت و ترسیل زر

دفتر ماہنامہ الحامد: الندوہ ایجوکیشنل ٹرسٹ، مین مری روڈ، چھتر، اسلام آباد پاکستان 46001

مولانا نعیم الدین طابع و ناشر نے پرنٹ یارڈ پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ ''الحامد'' لاہور سے شائع کیا

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	مصنف	عنوانات	نمبر شمار
3	مدیر کے قلم سے	کتاب وسنت یا کشف	1
9	مفتی محمد سعید خان	درس قرآن مجید	2
19	پروفیسر جاوید اقبال	دُعا سرورِ کونین ﷺ کے نقطۂ نظر سے	3
29	مفتی محمد سعید خان	زندگی کا مقصد کیا؟	4
39	محمد اورنگ زیب اعوان	مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور آپ کے تلامذہ کی علمی خدمات	5
50	مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی	اچھے لوگوں کی صحبت اور اس کے اثرات	6
60	مولانا حبیب اللہ اختر	آپ کے مسائل اور اُن کا شرعی حل	7

ادار یہ

کتاب وسنت یا کشف!

مدیر کے قلم سے

اللہ تعالیٰ نے اسلام کو بطور دین پسند فرمایا ہے اور قرآن کریم میں اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ قیامت میں مختلف ادیان میں سے جو دین مقبول بارگاہ الٰہی قرار پائے گا وہ صرف اسلام ہے۔اسلام بطور دین اپنانے یا بطور دین قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے ہر ہر شعبے میں اس کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کرے۔عقیدہ وہ ہونا چاہیے جو اسلام کہتا ہے،عبادات ، وہ اختیار کرنی چاہیں جن کی تعلیم اسلام نے دی ہے، معاملات کو ایسے ہی طے کرنا چاہیے جیسے کہ اسلام نے سکھایا ہے اور معاشرت میں بھی اسلام ہی کی جھلک نظر آنی چاہیے۔

خود اسلام کیا ہے؟ اسلام نام ہے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی کتاب،اس کے بعد اس کے نبی، حضرت رسالت مآب ﷺ کی تعلیمات اور پھر ان دو رہنما اُصولوں کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے جو اجتہاد کیا جاتا ہے، ان تین ہدایات پر عمل کرنے کا۔کبھی اللہ تعالیٰ کی کتاب میں کوئی بات بیان کی جاتی ہے، اس پر عمل کرلیا جاتا ہے۔کبھی حدیث (مع اپنی تمام اقسام کے) رہنمائی کرتی ہے کہ کتاب اللہ کی تعلیم پر عمل کرنا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ ان شرائط کی پابندی بھی ضروری ہے اور کبھی کتاب وسنت دونوں ایک مسئلے کا بیان کر دیتی ہیں لیکن مجتہد کا اجتہاد اس مسئلے کی مزید تفصیلات کو واضح کر دیتا ہے۔

اُمت مسلمہ ہمیشہ خیر پر رہی ، جب تک کہ ان رہنما اُصولوں کی روشنی میں مسلمان اپنے دین پر قائم رہے۔اہل علم ① کتاب ② سنت ③ اجماع اور ④ قیاس کے اصولوں پر فتویٰ دیتے رہے اور ان

کے فتاویٰ کی تائید وتردید کے علمی مباحثے اور قابل قدر تحریرات سے بھری کتابوں کے انبار آج تک امت کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں لیکن برصغیر میں پچھلے کچھ عرصے سے ایک نیا اصول متعارف کروایا جارہاہے اوروہ ہے ''کشف''

کچے اور بغیر گدرانے کے بظاہر، پکے ، یہ مشائخ ،اس اصول کو اپنے اپنے حلقوں میں نہایت شدومد سے متعارف کروار ہے ہیں ۔جگہ جگہ کشف کے چرچے ہیں اور ہر کوئی اپنے اپنے مشائخ کا کشف ایسے بیان کرنے پر لگا ہوا ہے جیسے یہ بھی کوئی شرعی اصول ہے۔ایسے جملے بولتے ہیں ''فلاں تاریخ کو عالم کشف میں یہ بات دکھائی گئی ہے'' ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کوفلاں کے بارے میں کشف ہوا'' ''بڑے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے تو پہلے ہی کشف میں یہ بات دیکھ لی تھی'' ''ہمارے حضرت کے تو کیا کہنے،ان جیسا صاحب کشف ہم نے تو آج تک نہیں دیکھا'' اوراس طرح کے بیسیوں جملے تاکہ سننے والے پر اپنے شیخ ،یا پھر اپنے سلسلے کا تفوق اوران کے کشف کا رعب گانٹھا جاسکے اور سادہ لوح عوام کوایسے مکشوفات سنا سنا کراپنے حلقے کووسیع کیا جاسکے۔

پھرظلم بالائے ظلم یہ ہے کہ ان کے مشائخ اپنے مکشوفات کی بنا پر یہ بھی بتاتے ہیں کہ فلاں صاحب کا انتقال ایمان پر ہوا یا کفر پر؟انہیں قبر کا عذاب ہورہا ہے یا نہیں؟اور وہ جہنم پہنچ گئے ہیں یا جنت اُن کا ٹھکانہ بنا۔

ایسے قطعی حکم لگارہے ہیں جیسے ان کا کشف، وحی الٰہی کے ہم پلہ ہےاور جو قطعی فیصلے اور خبریں صرف اور صرف نبوت کا حق ہے،انہیں مل چکا ہے،صرف حضرت صاحب الرسالۃ والوحی علیہ الصلاۃ والتسلیمات ہی کا حق تھا کہ وہ قطعی وحی الٰہی سے خبر پا کر ایسی باتیں ارشاد فرمایا کرتے تھے،اب ان مشائخ اوران کے مریدوں نے نبوت کے اس حق میں نقب زنی کر کے ایسی اطلاعات دینا شروع کردی ہیں اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اھل السنۃ والجماعۃ (دیوبندی) علماء کے حلقے اس وباء کی زد میں آگئے ہیں۔جن

کے مشائخ دنیا میں کتاب وسنت اور آئمہ کرام رحمہم اللہ کے اجتہادات کا پرچم بلند کرتے رہے، اب ان کی آئندہ نسلیں علم چھوڑ کر جہالت اور اتباع سنت کو چھوڑ کر اپنے مکشوفات کی تائید وترویج کو اپنا مسلک بنارہی ہیں۔

کوئی ان کو پوچھنے والانہیں اور کوئی ان کی اس بے راہ روی پر قید لگانے والانہیں؟ حال یہ ہے کہ زمین و آسمان کی اور حالت برزخ کی اطلاع دینے والے ان مشائخ کرام کو محض نماز کے مسائل معلوم نہیں۔ ان کی نمازیں سنت کے خلاف اور ان کے مریدوں کو کتاب وسنت سے زیادہ اپنے شیخ کا طرز عمل، جو محبوب ہے، یہ انہی مشائخ کی ناقص تربیت کا نتیجہ ہے۔ان مدعیان وراثت نبوت سے جا کر صرف اتنا پوچھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی، فعلی اور خبری صفات کی تقسیم کیا ہے تو انہیں اتنا بھی معلوم نہیں۔ ایمانیات کے مسائل تک کو نہیں جانتے اور چلے ہیں حکم لگانے کہ فلاں کا انتقال کفر پر ہوا اور فلاں کا ایمان کا۔

؎ سارے جہاں سے باخبر، اپنے جہاں سے بے خبر

کشف کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ ایک کیفیت محمودہ کا نام ہے اور بس۔ آپ اہل علم وتقویٰ سے، ارباب افتاء سے فیصلہ کرالیجیے کہ کیا کشف سے ثابت شدہ حکم قطعی ہوا کرتے ہیں؟ کیا ان کی تشہیر واجب ہوا کرتی ہے؟ کیا کتاب وسنت کی واضح ہدایات وتعلیمات کہ اہل ایمان سے حسن ظن رکھو اور اپنے مردوں کا تذکرہ، خیر سے کیا کرو کے مقابلے میں اپنے مشائخ کے مکشوفات پر اعتبار کیا جاسکتا ہے کہ فلاں کا ایمان مرنے سے پہلے سلب ہوگیا۔فلاں قبر پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ جہنم کی آگ سے بھرگئی ہے، فلاں شخص جہنم کے ابدی عذاب میں ڈال دیا گیا۔

——مودودی صاحب سے تمام تر اختلاف کے باوجود—— یہ بات کہ انہیں عذاب قبر ہوا اور جب تفہیم القرآن کے بارے میں فرشتوں نے پوچھا کہ کیوں لکھی تھی، تو کہنے لگے ریاکاری کی وجہ سے۔ معاذ اللہ کیا یہ باتیں اہل حق کو زیب دیتی ہیں کہ بجائے اس کے کہ وہ اپنے مریدوں کے عقائد پر محنت

کریں، ان کی کچھ علمی تربیت کریں اور تزکیہ نفس میں انہیں بدگمانی، غیبت، جھوٹ اور نفاق سے بچانے کی کوشش کریں اور صحیح تصوف کے احیاء اور اجاگر کی کوشش کریں وہ اپنی شخصیت کے چھپنے کا سامان پیدا کررہے ہیں۔ مکشوفات ومنامات کی اہمیت کو بڑھا اور کتاب وسنت کی اہمیت کو گھٹا رہے ہیں۔ کیا اپنے مریدوں کے طرزِ عمل پر غور کرنے سے بھی معلوم نہیں ہوتا کہ جماعت کدھر جارہی ہے۔

داغ دل گر نظر نہیں آتا　　　　بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

جب شیخ حیات ہوں تو پھر ان منامات ومکشوفات کی وقعت ہی کیا ہے۔ اور پھر مشائخ کیا تزکیہ واحسان کی منازل طے کرنے کے بعد معصوم ہوجایا کرتے ہیں؟ حقا کہ یہ اہل السنۃ والجماعۃ کے عقیدے ہی کے خلاف ہے۔ غـایۃ مـا فـی البـاب زیادہ سے زیادہ محفوظ ہوجاتے ہوں گے، تو کیا نفس وشیطان کا دخل ان کے منامات ومکشوفات سے بالکلیہ زائل ہوجاتا ہے۔ کاش کہ یہ مدعیان طریقت حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ گرامی نامہ پڑھ لیتے جو تصوف کی بنیادی تعلیمات پر مشتمل ہے اور ایک زریں اصول کو بیان کرتا ہے۔ کوئی پڑھے یا نہ پڑھے، آپ پڑھیے، اور کوئی سنے نہ سنے آپ سنیے اور سر دھنیے۔[1]

> ''میرے مخدوم اگر ان وقائع (مکشوفات والہامات) کا ہی اعتبار ہوتا اور ان خوابوں ہی پر بھروسہ کرلیا جائے تو پھر مریدوں کو مشائخ کی سرے سے ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔ مرید اپنی خوابوں ہی پر بھروسہ کرکے زندگی گذاریں۔ ان کے وقائع اور خواب اپنے شیخ کے سلسلے کے مطابق ہوں یا نہ ہوں اور شیخ راضی ہو یا ناراض ہو (انہیں فکرمند نہیں ہونا چاہیے) اگر اسی طرح ہونے لگے تو پھر پیری اور مریدی کا سب سلسلہ ہی تباہ ہوکر رہ جائے گا اور ہر ایک بوالہوس اپنے

---

[1] اگر وقائع را اعتبار بودو برمنامات اعتماد باشد مریدان رابہ پیران ہیچ احتیاج نبا شد والتزام طریقے از طُرق عبث می افتدچہ ہر مریدے موافق وقائع خود عمل خواھد کر دو مطابق منامات خود زندگانی خواھد نمود آن وقائع ومنامات موفق طریق پیر باشند یا نباشد ومرضی او بوند یا نبوند برین تقدیر سلسلہ پیری ومریدی برھم میخورد وھر بُو الھو سے بوضع خود مستقل میگردو مرید......

طور پر اپنا مستقل سلسلہ قائم کرے گا۔یادرکھو جو مرید واقعی مرید ہوتا ہے،اپنے شیخ کی رہنمائی کے مقابلے میں اپنے ہزار وقائع کو آدھے جو کے برابر بھی وقعت نہیں دیتا۔اور تزکیے کا طالب، مرید،اپنے شیخ کے ہوتے ہوئے اپنے خوابوں کو اضغاث احلام سے زیادہ کوئی چیز شمار نہیں کرتا۔

اور اپنے ان خوابوں وغیرہ کو بالکل ناقابل التفات گردانتا ہے شیطان مردود دشمن ہے،جو لوگ تصوف میں مضبوط اور راسخ قدم رکھتے ہیں،وہ بھی شیطان کے مکر سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتے اور اس مردود کی فریب سازیوں سے ڈرتے اور کانپتے ہیں،جو لوگ محض تصوف کے آغاز میں ہیں یا درمیان میں ہیں،ان کا تو ذکر ہی کیا ہے،زیادہ سے زیادہ آپ یہی کہہ سکتے ہیں کہ جو مشائخ تصوف کی انتہاء کو پہنچ جاتے ہیں وہ ابتدائی سالکین کی بہ نسبت،شیطان کی دخل اندازیوں سے محفوظ ہوجاتے ہیں اور بس۔

سو دیکھو ان لوگوں کے وقائع اور خواب وغیرہ قابل اعتماد نہیں ہیں اور یہ لوگ شیطان کے مکر سے محفوظ بھی نہیں ہیں'' (درالمعرفت،مکتوب ۲۷۳،ج:۱،ص:۱۹)

یہ ان لوگوں کے کشف اور خوابوں کو ردّ کیا جارہا ہے،جنھوں نے حضرت رسالت مآب ﷺ کو مولود شریف منانے پر خوش اور راضی دیکھا تھا۔

اس لیے کیا ان موجودہ دیوبندی مشائخ نے کوئی نیا دین بنانا ہے جس کے صرف دو اُصول ہوں گے۔

① ''ہمارے حضرت کی سنت یہ تھی اور ان کے حضرت کی سنت یہ تھی'' اور ''ہمارے حضرت کا

...... صادق ہزار وقائع را با وجودِ پیر بہ نیم جو نمخرید وطالب رشید بدولت حضور پیر منامات را از اضغاثِ احلام میشمرد وہیچ التفات بآنہا نمے نماید شیطانِ لعین دشمنے است قوی منتہیان از کیدا و ایمن نسیتند واز مکر او ترسان ولرزان انداز مبتدیان ومتوسطان چہ گوید ﴿غَایَةُ مَا فِی الْبَاب﴾ منتہیان محفوظ اندواز سلطانِ شیطان مصون بخلاف مبتدیان ومتوسطان پس وقائع ایشان شایانِ اعتماد نباشند واز مکرِ دشمن محفوظ نبوند.

قول وفعل یہ تھا'' اور ''ہمارے سلسلے میں تو کتاب وسنت سے زیادہ اپنے مشائخ پر اعتبار کیا جائے گا'' اور یہ آخری فقرہ زبان سے تو نہیں کہا جائے گا باقی تمام مریدوں کا عمل اس پر ہوگا اور حقیقت میں خواہ ان کے حضرت اوران کے حضرت کے حضرت کو نماز کے مکروہات تک کا علم ہی کیوں نہ ہو۔

(۲) اپنے حضرت کے منامات ومکشوفات کی اہمیت سب سے زیادہ ہوگی اوران کے فرمودات والہمات خواہ واضح طور پر کتاب وسنت اور آئمہ مجتہدین رحمہم اللہ کے اجتہاد سے ٹکراتے اور جھوٹ بھی ثابت ہوتے ہوں مگر ہم کہیں اور کریں گے وہی جو حضرت عالی نے ارشاد فرمادیا ہے۔

اس اندھی اکابر پرستی اور گمراہی سے خدا محفوظ رکھے۔ہم نے تصوف کے آئمہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر خلفاء حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب، حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب، حضرت مدنی کے صاحبزادے مولانا اسعد مدنی صاحب اور امام تصوف واھل السنۃ والجماعۃ حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہم کی زندگیوں کو دور سے نہیں، قریب سے اور دنوں نہیں، ماہ وسال تک اور سرسری طور پر نہیں، بہت گہری نظر سے دیکھا وہ تصوف وطریقت کے آئمہ کرام تھے لیکن کیا مجال ہے کہ ان کی مجلسوں میں کبھی کشف اور خوابوں کا تذکرہ بھی آتا ہو اور کیا مجال ہے کہ وہ کبھی اھل السنۃ والجماعۃ کے عقائد، علم اور عمل کے خلاف کوئی بات کہتے یا کسی طریق کی دعوت دیتے ہوں۔

اور ابھی تو کچھ زیادہ دن نہیں گذرے، ان حقائق کو دیکھنے، سننے اور جاننے والے ہزاروں گواہ، علماء، مشائخ اور عوام زندہ ہیں پھر ان کے بعد کی اس نسل کو کیا ہونے لگا ہے کہ مکشوفات ومنامات کو کتاب وسنت کے مقابلے میں لاتے ہیں۔

شعلہ عشق سیہ پوش ہوا تیرے بعد　　　شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اُٹھتا ہے

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اھل السنۃ والجماعۃ کے عقائد اور اعمال پر ثابت قدم رکھے۔

درس قرآن مجید

مفتی محمد سعید خان

⑤	① ② ③	④
رُكُوعُهَا ـ ١	سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ	اٰيَاتُهَا ـ ٧
رُکوع۔۱	سورۂ فاتحہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی	آیات۔۷

سورہ فاتحہ کہاں نازل ہوئی؟

(الف) عربی میں ''سُوْرٌ'' کے بنیادی معنی علوّ اور ارتفاع کے آتے ہیں اسی لیے ''سورۃ الخمر'' کے معنی ''شراب کی حدت اور تیزی'' کے ہیں۔ محاورہ بولتے ہیں: ''وإن لغضبہ سورۃ'' (اور یقیناً اس کے غصے میں شدت ہے)۔[1] اور ''سَوَّارٌ'' کا لفظ اس درندے کیلئے بولتے ہیں جو اپنے شکار کو اس کے سر سے پکڑے۔[2] ہر بلند و بالا شاندار عمارت کو بھی ''سُوْرَۃٌ'' کہا جاتا ہے[3] اور ''سُوْرَۃٌ

---

[1] (سور) السین و الواو والراء اصل و احد یدل علی علو و ارتفاع من ذلك سار یسور اذا غضب و ثار وان لغضبه سورة ...... و سورة الخمر: حدتها و غلیانها (معجم مقاییس اللغة. سور. ج: ٣. ص: ١١٥).

[2] و السَّوَارُ من الكلاب الذی یاخذ الراس . (تاج العروس ، سور . ج : ٦ ، ص : ٥٥٢)

[3] و كل منزلة رفیعة فهی سورة ماخوذة من سورة البنا (لسان العرب. سور. ج: ٦، ص: ٤٢٧).

السُّلْطان'' سے مراد''بادشاہ کی سطوت اوراس کا غلبہ'' ہے۔[1]

زیاد بن معاویہ بن ضباب النابغہ الذبیانی المتوفی ۱۸ق.ھ (قبل الھجرۃ النبویۃ علی صاحبھا الف الف التحیۃ و الثنا) اپنے ممدوح نعمان بن منذر کی شان میں اپنے مشہور قصیدے''أتانی أبیت اللعن'' میں کہتا ہے:[2]

الم تران الله اعطاك سورة　　　　ترى كل ملك، دونها يتذبذبُ

(کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ شرف ومنزلت عنایت فرمائی ہے کہ ہر بادشاہ آپ کے اس مقام کو دیکھ کر تھرّ ا اُٹھتا ہے)

قرآن کریم کی بھی ہر سورت کو اس لئے سورت کہا جاتا ہے کہ ہر ایک سورت میں ارتفاع اور بلندی ہے۔اس مبارک کتاب کی ہر ہر سورت اپنے اندر ایک رفعت ور بزرگی رکھتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ مختلف مقامات پر ارشاد فرمایا تا کہ مخاطبین کو یہ بتلایا جائے کہ جن آیات کی وہ تلاوت کر رہے ہیں ان کا مجموعہ (سورت) بہت بلند اور برتر ہے۔

(ب) یا پھر اس لفظ (سورۃ) کو''السـُّــــوْرُ'' سے مشتق مانا جائے اور اس کے معنی فصیل شہر کے آتے ہیں۔خریر بن عطیہ الخطفی التمیمی المتوفی ۱۱۴ھ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی مدح اور ان کے قاتل ابن جُرمُوز کی ہجو میں کہتا ہے:[3]

لما أتى خبر الزبير تو اضعت　　　　سور المدنية و الجبال الخشعُ

(جب حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی آمد ہوئی تو شہر کی فصیلیں اور پہاڑ ڈھ پڑے) سو اس اعتبار سے سورت کے

---

[1] لسان العرب. سور. ج: ٦، ص: ٤٢٦.

[2] دیوان النابغة الذبیانی. ص: ٢٥.

[3] لسان العرب، سور، ج: ٦، ص: ٤٢٦./تاج العروس، سور، ج: ٦، ص: ٥٥٢.

معنی فصیل شہر کے ہوئے یعنی ہر سورت میں ادبیات، لغات، اوامر نواہی، اسرار و رموز اور گونا گوں علوم کا ایک شہر آباد ہے اور ان تمام علوم کو جس فصیل نے گھیرا ہوا ہے اس فصیل کو عربی میں سورت کہتے ہیں اور پھر اس فصیل شہر کا اپنا بھی ایک نام ہے اور وہ نام کہیں ''الفاتحہ'' ہے تو کہیں ''البقرۃ''، کہیں ''المائدۃ'' ہے تو کہیں ''الکوثر''۔ اس طرح علوم و معارف کے ہر شہر کی فصیل کا اپنا اپنا الگ سے ایک نام ہے۔

(ج) مندرجہ بالا دونوں توجیہات اس بنا پر قبول کی جائیں گی کہ جب ''سورۃ'' میں واؤ کو حرف اصلی مانا جائے اور اگر اس لفظ کو ''سؤرۃ'' مہموز العین مانا جائے تو پھر اسے اسأرت سے مشتق ماننا ہوگا، جو کہ بقیہ یا پس خوردہ کے معنی میں آتا ہے۔[1] یہ بقیہ یا پس خوردہ درحقیقت اصل ہی کا ایک جزو ہوتا ہے اس لے سورت کو سورت اس لئے کہتے ہیں کہ وہ باقی قرآن کریم کا ہی ایک جزو ہے۔ اس اعتبار سے سورت کا معنی ٹکڑا یا حصہ ہو گا۔ ہر ایک سورت قرآن کریم کا ایک عظیم الشان حصہ یہ ٹکڑا جس کی اپنی ایک ابتداء اور ایک انتہا ہے. اس طرح ان 114 خوبصورت اور جلیل القدر ٹکڑوں نے مل کر ایک کتاب کو مرتبہ کیا ہے، جسے قرآن حکیم کہا جاتا ہے۔[2]

قارئین جب سُوَرُ (سورت کی جمع) قرآنی پر غور کریں گے تو ان کے ذہن میں ایسے بہت سے سوالات جنم لیں گے جن کے جوابات کا تعلق تو درحقیقت ''علوم القرآن'' سے ہے لیکن ان میں سے دو سوالات ایسے ہیں جن کا جواب اس مقام پر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] ومن قال سُؤرَةٌ فمن أَسْأَرتُ أي البقيتُ منهابقية كأنها قطعة مفردة من جملة القرآن (المفردات فى غريب القرآن، سور، ص: ٤٢٨).

[2] قال أبو الهيثم: والسورة من سور القرآن عند نا قطعة من القرآن سبق وُحدانها جمعها كما أن الغرفة سابقة للغرف، وأنزل الله عزوجل القرآن على نبيّه ﷺ، شيئا بعد شيء وجعله مفصلا، وبيّن كل سورة بخاتمتها وبادئتها وميزها من التى تليها. (لسان العرب، سور، ج:٦، ص:٤٢٧).

(د) پہلا سوال تو یہ کہ ان تمام سورتوں کو سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ والناس تک یوں کس نے مرتب کیا تھا، جیسے کہ موجودہ قرآن کریم اپنی قدیم ترتیب کے ساتھ اب ہماری نگاہوں کے سامنے ہے؟ اس اہم سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی سورتوں کی ترتیب کے بارے میں، امت کے اہل علم میں تین مؤقف رہے ہیں۔

① **پہلا مؤقف:** یہ کہ قرآن کریم کی سورتوں کی ترتیب کہ کونسی سورت کس مقام پر آئے گی، اس سے پہلے اوراس کے بعد کون سی سورت رکھی جائے گی، یہ کام حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہاد پر موقوف تھا اور موجودہ ترتیب انہی کے اجتہاد کے مطابق ہے۔ ترتیب سُوَر میں تغیر وتبدل کوئی جرم اور گناہ نہ تھا اس لیے جس صحابی رضی اللہ عنہ نے جیسے مناسب سمجھا، اپنے زیر تلاوت قرآن کریم کو ویسے ہی مرتب کیا یا کسی کاتب سے ویسے ہی مرتب کروالیا۔ حضرت ابی کعب رضی اللہ عنہ کے مصحف کا آغاز سورۂ فاتحہ سے ہوتا تھا پھر اس کے بعد سورۂ بقرہ، سورۂ ال عمران اوراس کے بعد بجائے سورۂ المائدہ کے سورۂ الانعام کی ترتیب تھی۔ ایسے ہی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں سورۂ بقرہ کے بعد سورۂ النساء تحریر کی گئی اوراس کے بعد سورۂ ال عمران کو تحریر کیا گیا۔ امیر المؤمنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا مصحف ترتیب نزولی کے مطابق تھا۔ اس کا آغاز سورۂ العلق سے ہوتا تھا اوراس کے بعد سورۂ مدثر پھر سورۂ ق پھر سورۂ مزمل اس کے بعد سورۂ تبت پھر سورۂ تکویر پھر بقیہ مکی سورتیں اور بعد ازاں مدنی سُوَر تحریر کی گئی تھیں۔ اور یہ تمام روایات اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ اکابر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس بات میں کچھ حرج محسوس نہیں کرتے تھے کہ سُوَرِ قرآنی کی ترتیب میں اجتہاد کریں۔

② **دوسرا مؤقف:** یہ کہ قرآن حکیم میں ترتیب سور کا کچھ حصہ تو حضرت صاحب الرسالۃ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب فرما دیا تھا اور کچھ حصہ ایسا ہے جو حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اجتہاد کے مطابق

ہے۔ سورۂ الفاتحہ سے لے کر سورۂ انفال (سبع طوال) تک پھر وہ تمام سورتیں جو ''حم'' سے شروع ہوتی ہیں (حوامیم) اور اس کے بعد سورۂ ق سے لے کر آخر قرآن (مفصل) تک کی تمام سورتیں تو حضرت رسالت مآب ﷺ نے ترتیب دے دی تھیں البتہ ان کے علاوہ باقی سُوَر کی ترتیب کا حق، آپ نے اپنی اُمت کو تفویض کر دیا تھا اور اُمت کے قائدین سب سے پہلے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تھے چنانچہ بقیہ قرآن میں سور کی ترتیب، ان کا اجتہاد برحق ہے۔

③ تیسرا مؤقف: یہ کہ قرآن کریم کی تمام سورتوں اور آیات کی ترتیب حضرت رسالت مآب ﷺ نے بحکم الٰہی، دے دی تھی اور آپ کو بذریعہ وحی ایک ایک آیت اور ہر ہر سورت کے متعلق یہ ہدایت دی جاتی تھی کہ کس سورت کو کس سورت سے پہلے اور کس سورت کے بعد رکھنا ہے اور یہ تک بھی بتا دیا جاتا تھا کہ کون سی آیت کریمہ کسی مقام پر آئے گی۔

اہل علم و تحقیق کے نزدیک یہی مؤقف درست ہے اور اس کے خلاف جتنی بھی روایات ملتی ہیں وہ یا تو موضوع ہیں اور پھر ان کی تاویل کی جاتی ہے۔ بے شمار دلائل سے اس مؤقف کو علمی طور پر ثابت کیا جاتا ہے۔ اس کے حق میں آنے والے تین دلائل پر آپ بھی غور فرمالیجیے کہ حق یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات وسور، سب کی ترتیب حضرت رسالت مآب ﷺ طے فرما کر دنیا سے تشریف لے گئے تھے۔

دلیل نمبر ①

(ا) حضرت رسالت مآب ﷺ کی نماز تہجد کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ، علامہ میرک رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں کہ [1]

اور صحیح بات یہ ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ بقرہ

---

[1] والصواب ثم قرأ البقرة وآل عمران والنساء والمائدة ثم ركع (جمع الوسائل فی شرح الشمائل، ......

پڑھی پھر سورۂ آل عمران پھر سورۂ النساء اور اس کے بعد سورۂ المائدہ کی تلاوت کی اور پھر رکوع کیا۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کریم کی ان سورتوں کی ترتیب کم سے کم یہی تھی، جو ترتیب آج ہمارے ہاتھوں میں محفوظ مصحف کی ہے۔ اسی لیے علامہ طاہر الجزائری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو جعفر النحاس رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ [1]

صحیح مؤقف یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو ترتیب آج ہمارے پاس ہے، تمام سورتیں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی اسی ترتیب پر تھیں اور ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ مصحف کی یہ ایک ہی ترتیب ہے جس پر سب کا اتفاق ہو گیا تھا۔ اور ابن حصار رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا کہ سورتوں اور آیات کو ان کے اپنے اپنے مقام پر ترتیب سے رکھ دینا یہ سب کام وحی الٰہی کے مطابق ہوا ہے۔

(ب) صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت آئی ہے کہ انھوں نے فرمایا سورۂ بنی اسرائیل سے لے کر سورۂ الانبیاء علیہم الصلاۃ والسلام تک کی تمام سورتیں تو انھوں نے اپنے قبول اسلام کے ابتدائی دور ہی میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر یاد کر لی تھیں۔ [2]

یہ روایت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ سور قرآنی میں کوئی نہ کوئی ترتیب ضرور تھی حضرت عبداللہ بن

......باب ما جاء فی عبادة النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج:۲، ص۹۵).

[1] المختار ان تالیف السور علی هذا الترتیب من رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم وإنما جمع في المصحف علی شيء واحد. وقال ابن الحصار: ترتیب السور ووضع الآیات في مواضع إنما کان بالوحی.(التبیان لبعض المباحث المتعلقه بالقرآن، الفصل الرابع فی جمع القرآن و ترتیبه، الصلة الثانیة، ص:۱۱۰).

[2] حدثنا آدم، حدثنا شعبة، عن أبي إسحاق قال: سمعت عبدالرحمن بن یزید قال: سمعت ابن......

مسعود رضی اللہ عنہ بھی اسی ترتیب کا ذکر کر رہے ہیں ۔ چنانچہ ان کی بیان کردہ ترتیب (سورۂ بنی اسرائیل ، الکھف ، مریم ، طہٰ ، اور الانبیاء علیہم الصلاۃ والسلام) آج بھی قرآن کریم میں قائم ہے ۔ اسی لیے مناھل العرفان میں شیخ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوبکر النباوی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ [1] وہ فرماتے تھے:

قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نازل فرمایا ۔ پھر اسی قرآن کے مختلف حصے تئیس برس میں نازل کیے گئے ۔ جب بھی کوئی نیا واقعہ پیش آتا تھا تو اس کے مطابق وحی نازل کی جاتی تھی اور جب کوئی سوال پوچھتا تھا تو اس کے جواب میں بھی وحی نازل کی جاتی تھی اور حضرت جبرئیل امین علیہ الصلاۃ والسلام ، حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو بتاتے جاتے تھے کہ یہ سورت کیسے مرتب ہوگی ، آیات کس ترتیب سے رکھی جائیں گی اور قرآن کریم کے حروف کس ترتیب سے ہوں گے ۔ اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم یہ تمام کام سرانجام دیتے تھے ۔ اس لیے اب اگر کوئی شخص قرآن کریم کی کسی بھی سورت کو ترتیب سے ہٹاتا یا آگے پیچھے کرتا ہے تو وہ قرآنی ترتیب میں خلل ڈالنے کے جرم کا ارتکاب کرتا ہے ۔

......مسعود رضي اللّٰه عنه قال في بني إسرائيل والكهف، ومريم ، إنهن من العتاق الاول وهن من تلادي فسينغضون إليك روؤسهم قال ابن عباس: يهزون. وقال غيره نغضت سنك: أي تحركت .[الحديث ٤٧٠٨ ـ طرفاه في] (صحيح البخاري ، كتاب تفسير القرآن،سورة بني إسرائيل،رقم الحديث: ٤٧٠٨،ج:٢،ص:٢٦٦)

[1] انزل الله القرآن الى سماء الدنيا ثم فرقه في بضع وعشرين سنة ، فكانت السورة تنزل لأمر يحدث ، والآية جواباً لمستخبر ، ويقف جبريل النبي صلى الله عليه وسلم على موضع السورة والآيات والحروف. كله من النبي صلى الله عليه وسلم فمن قدم سورة أو أخرها أفسد نظم القرآن. (المبحث التاسع فى ترتيب آيات القران وسوره، ج:١ ، ص:٣١٦).

دلیل نمبر ②

ہمارے اس مؤقف ـــــ ہمارا یہ قرآن اپنی سورتوں، آیات اور حروف کے اعتبار سے حضرت رسالت مآب ﷺ بحکم الٰہی مرتب فرما کر ہی دنیا سے تشریف لے گئے تھے ـــــ کی دوسری دلیل پر بھی آپ غور فرما لیجیے اور وہ یہ ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ربیع الاول ۱۱ھ میں ہوا، اور اس سے قبل کا جو رمضان سنہ ۱۰ھ کا تھا، اس میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دو مرتبہ آپ کو اور آپ نے دو مرتبہ اُنھیں مکمل قرآن حکیم سنایا۔ رمضان میں قرآن حکیم سنانے کا واقعہ اگرچہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ پیش آچکا تھا لیکن چونکہ آپ کی حیاتِ طیبہ کا یہ آخری رمضان تھا اسلئے اللہ تعالیٰ نے اس کا خاص اہتمام فرمایا کہ جس کتاب کو اس نے تا قیام قیامت باقی رکھنا ہے، اس کی آیات، سور، ترتیب، تبدّل، تنسیخ کے تمام مراحل مکمل ہو جائیں اور یہ عظیم انعام امت مسلمہ کے حوالے کر دیا جائے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے "فتح الباری" میں اس روایت کا ذکر کیا ہے:

أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یعرض القرآن کل سنة علی جبریل، فلما کان فی السنة التی قبض فیھا عرضه علیه مرتین.

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال (رمضان میں، جتنا بھی قرآن اس وقت تک نازل ہو چکا ہوتا تھا) حضرت جبرئیل علیہ السلام کو سناتے تھے لیکن جس برس آپ کا انتقال ہونا تھا، آپ نے دو مرتبہ قرآن کریم اُنہیں سنایا۔

ایسے ہی حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نے بھی آپ کو دو مرتبہ قرآن حکیم سنایا:

عرض القرآن علی رسول اللّٰہ ﷺ عرضات، ویقولون ان قراء تنا ھذہ ھی العرضة الأخیرة.

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو (حضرت جبرئیل علیہ السلام نے) کئی مرتبہ قرآن حکیم سنایا تھا اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے تھے کہ اب جس طرح ہم قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہیں، یہ اسی طرح ہے جیسے کہ آخری مرتبہ (عرضہ اخیرہ) آپ کو قرآن کریم سنایا گیا تھا۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور محدثین کی اصطلاح میں یہ ''عرضۂ اخیرہ'' یعنی ''آخری دور'' کہلاتا ہے۔ ''دَور'' درحقیقت حفاظ کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دو حافظ حضرات ایک دوسرے کو زبانی طور پر قرآن حکیم سنائیں، تو یہ ''آخری دور'' یا ''عرضہ اخیرہ'' حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کے درمیان دو مرتبہ ہوا، اور قرآن کریم کی جو آیات منسوخ ہونا تھیں یا ہوچکی تھیں، آیات کی ترتیب اور سورتوں کی ترتیب یہ تمام مراحل اس طرح طے ہوگئے تھے۔ اسی لئے علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ترتیب السور ھکذا ھو عند اللّٰہ وفی اللوح المحفوظ،وھو علی ھذا الترتیب کان یعرض علیہ السلام علی جبریل کلّ سنۃ ما کان یجتمع عندہ منہ،وعرض علیہ فی السنۃ التی توفي فیھامرتین.

قرآن حکیم کی سورتوں کی ترتیب اللہ تعالی کے ہاں یہی ہے (جو کہ آج قرآن حکیم میں ہے) لوح محفوظ میں بھی قرآن حکیم انہی سورتوں کے مطابق ہے۔ اور سورتوں کی یہی وہ ترتیب ہے جس کے مطابق حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جتنا بھی قرآن حکیم نازل ہوچکا ہوتا تھا، حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کو سناتے تھے اور یہاں تک کہ جس سال آپ کا انتقال ہوا ہے، آپ نے سورتوں کی اسی ترتیب کے مطابق قرآن حکیم انہیں سنایا تھا۔

ان تمام تصریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے حضرت جبرئیل امین علیہ الصلاۃ والسلام کو اور انہوں نے آپ کو جو قرآن کریم سنایا تھا تو وہ ایک ''مرتب قرآن'' تھا اس میں سورتوں کی بھی اپنی ایک ترتیب تھی۔ پھر اسی ترتیب کے مطابق سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے اس ''مرتب قرآن'' کے مطابق کئی نسخے تحریر کروا کر پوری اُمت میں پھیلائے اور اپنے زیرِ خلافت علاقوں سے مرکزی شہروں میں یہی ترتیب تقسیم کروائے۔ حضرت عبیدہ بن عمرو سلمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ان الذی جمع علیہ عثمان الناس یوافق العرضۃ الاخیرۃ.

وہ قرآن کریم جس پر امیر المؤمنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور پوری اُمت کو متفق کردیا تھا، وہ

(فتح الباری، کتاب فضائل القرآن، ج:۹،ص:٤٤)

قرآن اسی ترتیب کے مطابق تھا جو آخری دور میں حضرت رسالت مآب ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ الصلاۃ والسلام تو اورانہوں نے آپ کو ترتیب سنایا تھا۔

یہی قرآن کریم بغیر کسی ادنی ترمیم واضافے یا تغیر وتبدل کے قرناً بعد قرن اور نسلاً بعد نسل ہمارے آباؤاجداد تک پہنچا، اور پھر یہی مرتب قرآن آج ہمیں جدید دور میں یہ مطبوعہ (Printed) صورت میں ملتا ہے اوراس طباعت (Printing) نے اس ''مرتب قرآن'' کو اب اتنا پھیلا دیا ہے کہ اس کے مٹنے کے تو درکنار تغیر تک کے آثار معدوم ہوگئے ہیں کیا ہمارے مؤقف کی صحت کے لیے یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ سور قرآنی کی ''موجودہ ترتیب'' بحکم الٰہی حضرت رسالت مآب ﷺ ہی کی ''ترتیب دادہ'' ہے ہمارے اس مؤقف پر کوئی قاری یہ اعتراض بھی کرسکتا ہے کہ جب قرآن کریم بالکل مرتب تھا تو حضرت صاحب الوحی علیہ الصلاۃ والسلام نے اسے باقاعدہ لکھوا کیوں نہ دیا تھا؟ تو اس کا جواب علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

إنما لم یجمع صلی الله علیه وسلم القرآن فی المصحف؛ لما کان یترقبه من ورود ناسخ لبعض أحکامه أو تلاوته، فلما انقضی نزوله بوفاته ألهم الله الخلفاء الراشدین ذلك، وفاء بوعده الصادق بضمان حفظه علی هذا الامة، فکان ابتداء ذلك علی ید الصدیق بمشورة عمر. (الاتقان، النوع الثامن عشر فی جمعه وترتیبه، ج:۱، ص:۲۰۲)

حضرت رسالت مآب ﷺ نے قرآن کریم کو باقاعدہ کتابی صورت میں اس لیے تحریر نہیں کروایا کہ اس بات کا امکان آپ کی حیات طیبہ کی آخری سانس تک موجود تھا کہ شاید کوئی مزید وحی آجائے جو کہ پہلے نازل شدہ کسی آیت یا حکم یا تلاوت کو منسوخ کردے۔ لیکن جب آپ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم کام خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کو الہام فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے جو حفاظت قرآن کریم کی ذمہ داری لی تھی اوراس اُمت کا فریضہ ٹھہرایا تھا، اس کا آغاز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مبارک ہاتھوں سے ہوا اور قرآن کریم کو اس طرح کتابی صورت میں لانے کا مشورہ انہیں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دیا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

زندگی کا مقصد کیا؟

مفتی محمد سعید خان

کیا کسی مومن کی با مقصد زندگی اتنی بے مصرف ہو سکتی ہے؟ ہمارے اسلاف چاند تک نہیں پہنچے مگر انہوں نے اس زمین پر ہر دور میں انسانیت کو سینکڑوں چاندوں کی ٹھنڈی چاندنی دی، سکون و راحت کی زندگی دی۔ جہالت وغربت کا خاتمہ کیا وہ مکھیوں کی طرح اڑے اور مچھلیوں کی طرح تیرے تو نہیں مگر انسان بن کر اس دنیا میں ضرور رہے۔ وہ کیا تھے اور ہم کیا ہیں؟ کہاں وہ با مقصد زندگیوں کے حامل چلتے پھرتے انسان اور دورِ عروج اور کہاں یہ بے مقصد زمین کا بوجھ، چلتی پھرتی لاشیں اور دور زوال۔

میر سپاہ ناسزا ، لشکریاں شکستہ صف
آہ ! وہ تیرنیم کش جس کا نہ ہو کوئی حدف
تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف[1]

تعلیم: آسمان سے پیغام آنا بند ہو چکے تھے انسانیت تاریکی میں ڈوب چکی تھی کوئی اس کو بحر ظلمت سے نکالنے والا نہ تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے چھ سو سال بعد روشنی کی پہلی کرن پھوٹی وحی نے اس شب دیجور کے پردے چاک کیے انسانیت کی رہنمائی کی اور پہلا لفظ جو اللہ نے اپنے بندوں سے ہم کلامی کے لیے اختیار فرمایا وہ تھا اقراء (پڑھیے) جس امت کو پہلے دن سے پہلے لفظ کے ساتھ تعلیم و تعلم، درس و تدریس کے میدان سے منسلک کر دیا گیا ہو اس کے گھر کے آنگن میں یوں جہالت کے خیمے گڑ جائیں

---

[1] کلیات اقبال، بال جبریل، ص:۳۳۱

وہ بحثیت قوم تعلیم کے میدان میں اس بری طرح پٹ جائے کہ ان کے تمام مہرے اس بساطِ علم میں مات کھا جائیں! اس بد قسمتی و کم نصیبی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

ہم اپنا اور اسلاف کا موازنہ اگر تعلیم میں کریں تو برصغیر میں خاندانِ غلاماں کے آخری بادشاہ غیاث الدین بلبن نے برصغیر میں تو تعلیم کو عام کیا ہی یہاں دہلی میں بیٹھ کر مکہ معظّمہ میں مدرسہ تعمیر کروایا رمضان المبارک ۸۱۴ھ میں جب اس مدرسہ کا افتتاح ہوا تو حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی چاروں مسالک کے علماء کو تعلیم کے لیے مقرر کیا گیا اور اس مدرسے کے تمام اخراجات بلبن یہاں سے مکہ معظّمہ بھجواتا تھا۔

عباسی دور میں بغداد سے لے کر قرطبہ (سپین) تک ہر مسجد کے ساتھ ایک کتب خانے کا وجود ضروری قرار دیا گیا اور اس میں طب، جراحی، ادویہ سازی، ریاضی، منطق، جغرافیہ، تاریخ ہیئت، ادب، فلسفہ، کیمیا، طبیعات، فلکیات، موسیقی، مصوری، حدیث، فقہ اور تفسیر کی مستند کتابیں دستیاب تھیں۔ حتیٰ کہ بغداد جب تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا تو اس وقت صرف بغداد شہر کے سرکاری کتب خانوں میں موجود کتابوں کی تعداد مورخین نے ۴ کروڑ بیان کی ہے، عام عوام کے ذاتی کتب خانے (Privat Collication) جو شرفاء کے ہاں بالعموم مل جاتے تھے اس کے علاوہ تھے۔ شہر کی ویرانی پر تاتاری فوج نے ان کتابوں کو دریائے دجلہ میں جب ڈالنا شروع کیا تو ایک مقام پر پل کی ضرورت ہی نہ رہی دریا کہ تہہ سے لے کر سطح تک کتابیں ہی کتابیں تھیں اور فوج انہیں پر چل کر بغداد میں آتی جاتی رہی۔

مصر میں فاطمیوں نے جو کتب خانے قائم کیے ان میں سے صرف ایک کتب خانے ہی میں ہیئت، کیمیا، حدیث، اور لغت پر سولہ کتابیں موجود تھیں۔

اندلس میں امیر المؤمنین الحکم الثانی کے ذاتی کتب خانے میں ۴ لاکھ کتابیں تھیں جن کی فہرستیں باقاعدہ جب مرتب کی گئیں، تو ان فہرستوں کی ہی چوالیس جلدیں بن گئیں۔

اگر امت اور اسلاف میں تعلیم و تعلم کا رجحان نہ ہوتا تو کیسے اتنے عظیم الشان کتب خانے وجود میں آسکتے تھے؟ آپ تاریخ میں اتنا کیوں پیچھے جائیں آج بھی لندن میں ایسٹ انڈیا آفس کمپنی کی لائبریری میں موجود ان کتابوں، رپورٹوں اور مختلف شاہی فرامین کو جا کر دیکھیں جو انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں برصغیر سے انگلینڈ منتقل کئے تو ان میں لاکھوں قلمی نسخے ہیں، ایسی ایسی نایاب اور نادر کتابیں ہیں جنہیں ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو احساس ہوا کہ اسلاف اور اکابر کو علم سے کتنی محبت تھی اور آہ ان کے جانشین کس قدر کم ہمت نکلے ان کے علوم وفنون میں ترقی تو درکنار خود اس سرمائے سے بھی مستفید نہ ہوسکے۔ استنبول میں مکتبہ سلمانیہ کا عظیم الشان غالبًا واحد کتب خانہ ہے جو خلافت عثمانیہ کی وجہ سے یورپ کی دست برد سے محفوظ رہا اسے دیکھنے پر عقل حیرت زدہ ہوتی ہے کہ کبھی اس قدر علوم وفنون کی امین یہ امت مسلمہ بھی تھی۔ علامہ اقبال مرحوم جب یورپ سے واپس لوٹے تھے تو یہی رونا رویا تھا کہ

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ[1]

یہ کتابیں، یہ تعلیم یہ جامعات (Universties) یہ کتب خانے اس لیے تھے کہ ان اسلاف کی زندگیاں بامقصد تھیں۔ ان کا مقصد اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا اور خوش رکھنا تھا اور اس عظیم مقصد کے لیے انہوں نے علم کا راستہ اختیار کیا تھا۔ آج کیا ہماری نسلوں کا بھی یہی راستہ ہے؟ جنہیں زندگی کے مقصد کی ہی خبر نہیں انہیں راستے سے کیا بحث!

[1] کلیات اقبال، بانگ دراء، زیر عنوان خطاب بہ جوانان اسلام، ص: ۱۸۰

آپ ٹھنڈے دل سے غور کیجیے ہمارے موجودہ معاشرے میں مطالعے کا رجحان کتنا ہے؟ ہمارے نوجوانوں کو علم سے کتنی مناسبت ہے؟ ہم اپنی آمدنی کا کتنا حصہ تعلیم، کتابوں کے خریدنے اور تعلیمی اداروں کی مدد کے لیے صرف کرتے ہیں؟ جو کتب خانے مختلف شہروں کے سکول، کالج، یونیورسٹی یا نیشنل سینٹرز کے ساتھ ملحق ہیں وہاں آبادی کے تناسب سے لائبریری کی رکن سازی (Membership) کی نسبت کیا ہے؟ اگر ان سوالات کا جواب مایوس کن ہے تو پھر آخر کس برتے پر اللہ تعالیٰ اس دنیا کی قیادت اس امت کے سپرد فرمادے؟ اور اگر آپ اپنی زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشی و رضا حاصل کرنا قرار دے چکے ہیں، تو اس عالیشان منزل کے حصول کے لیے تعلیم کو وسیلہ اور سبب بنا لیجیے اس میدان میں کام کیجیے۔

معیشت: معیشت کے میدان میں اسلاف کے لیے سب سے اہم مسئلہ ذرائع آمدن کا تھا وہ جائز ہیں یا ناجائز؟ ان کا کھانا، پینا، تعمیر، لباس، تعلیم، صدقات، زندگی کے تمام شعبوں میں خرچ ہونے والی رقوم، حلال ذرائع سے آرہی ہیں یا مشکوک ہیں۔ حرام کے تو وہ قریب جانا موت کا منہ سمجھتے تھے۔ خلیفہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے پہلے اپنی بیٹی ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو طلب فرمایا اور ان سے کہا جب سے میں خلیفہ ہوا ہوں میں نے سرکاری خزانے سے مسلمانوں کا ایک دینار یا ایک درہم بھی کبھی نہیں لیا۔ ہاں پیٹ بھرنے کے لیے باریک نہیں موٹا آٹا لیتا رہا ہوں اور تن ڈھانپنے کے لیے باریک نہیں موٹا کپڑا البتہ لیا ہے۔ میں نے تو ان کے مال غنیمت میں سے بھی جو کہ سرکاری خزانے میں آتا ہے کبھی کچھ نہیں لیا نہ تھوڑا نہ بہت البتہ (۱) ایک حبشی غلام (۲) ایک پرانی چادر اور (۳) گھر کا پانی لانے کے لیے ایک اونٹنی لی تھی جب میں مر جاؤں تو یہ تینوں چیزیں عمر کے حوالے کر دینا اور ان سے تصدیق کرا لینا، گواہ بنا لینا کہ ہم نے مسلمانوں کی یہ امانت بھی

لوٹا دی تھی۔

ان کی وفات کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ تینوں چیزیں لے کر حضرت عمر اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کے پاس آئیں اور انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حبشی غلام، پرانی چادر اور اونٹنی کو دیکھ کر رونے لگے اور اتنا روئے کہ آنسوؤں نے زمین کو تر کر دیا پھر فرمایا اللہ رحم کرے ابو بکر پر انہوں نے تو اپنے بعد آنے والے خلفاء کو کتنے تنگ راستے پر چلا دیا (یعنی اتنی احتیاط کیسے ہوگی؟) پھر حکم دیا کہ یہ سامان سرکاری خزانے میں واپس پہنچا دیا جائے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا سبحان اللہ ایک حبشی غلام، پانی ڈھونے والی اونٹنی اور ایک پرانی چادر جس کی قیمت پانچ درہم سے زیادہ نہیں، آپ اسے واپس لے کر کیا کریں گے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ گویا بے بس نظر آنے لگے اور فرمایا عبدالرحمٰن تمہی بتاؤ میں کیا کروں؟ انہوں نے کہا یہ تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کو واپس کر دیں۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین تھے فرمایا عبدالرحمٰن اللہ کی قسم جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا دین دے کر بھیجا تھا میرے دور میں مسلمانوں کے مال کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا کہ وہ مال ذاتی ملکیت بن جائے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ تو بوقت وفات ان چیزوں کو سرکاری کو داخل کرانے کا حکم دیں اور میں یہ سرکاری مال ان کے خاندان کو دے دوں؟ میں نے بھی تو مرنا ہے پھر اللہ کو کیا جواب دوں گا۔[1]

یہ عالم ہے اپنے ذاتی اموال کے علاوہ دوسرا مال خرچ کرنے کا۔

سودی معیشت دنیا میں اس وقت بھی رائج تھی مگر اسلاف پر اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشی کا حصول اس قدر غالب تھا کہ دنیا اپنی تمام تر رعنائیوں کے باجود مٹی میں مل گئی تھی۔

آج ہم اپنے آپ کو دیکھیں تو حلال وحرام کی تمیز بٹتی چلی جارہی ہے۔ ایک ایک روپیہ اور ایک ایک پیسہ سود کی گندگی میں لتھڑا ہوا ہے، حلال مال کے استعمال اور خورد ونوش سے وسعت ظرفی جنم لیتی ہے،

---

[1] طبقات ابن سعد، ج:۳، ص:۱۳۹.

انسان اپنے نفس کو مٹانا اور اپنے آپ میں رہنا سیکھتا ہے اور حرام مال تو نمود و نمائش اور کم ظرفی بے صبری کو جنم دیتا ہے۔ جس آدمی کی رگوں میں صحت منداور بیماری سے پاک خون دوڑ رہا ہوتا ہے اس کی صحت خود اپنی شہادت دیتی پھرتی ہے اور جب خون گندا ہو جاتا ہے تو جسم پر داغ پھوڑے اور دانے سر ابھارنے لگتے ہیں۔ بالکل اسی طرح آج بھی جہاں حلال مال ہے، صحت مند خون ہے وہاں اعلیٰ ظرفی ہے، وہ لوگ اپنے میں سمائے اور مٹے ہوئے ہیں اور جہاں حرام مال ہے وہاں شادیوں میں، سالگرہوں میں ہر ہر موقع پر نمود و نمائش ہے ریاکاری ہے آخر حرام مال اور گندے خون کا اظہار کیسے ہو؟ کیا حلال کا پیسہ بھی کبھی اسراف کا متحمل ہوا ہے؟

ہماری زندگیاں اگر بامقصد ہوتیں اور معاشرے سے اچھے افراد پیدا ہو رہے ہوتے تو یہ مسئلہ ہی نہ اٹھتا کہ بینک کے سود کا کیا حل کیا جائے؟

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا بینک کا متبادل ضروری ہے؟ کیا دنیا میں ہر ایک شر کا متبادل ضرور چاہیے؟ کیا یہ آسمانی وحی پر قائم شدہ نظام ہے کہ اس میں ردوبدل نہیں کیا جاسکتا؟ تجارت، لین دین، کاروبار قرضے اس وقت تو سے شروع نہیں ہوئے جب سے بینک قائم ہوئے ہیں۔ دنیا میں یہ معاملات شروع دن سے چلے آرہے ہیں۔ یہ بینک تو چند صدیاں قبل کی پیداوار ہیں۔ اس سے پہلے مسلمانوں نے بارہ سو سال دنیا کی چھاتی پر مونگ دلی ہے، حکومت کی ہے، خلافت کا جھنڈا گاڑے رکھا ہے، وہ کیسے کاروبار کرتے تھے؟ دنیا کے دیگر ممالک کے ساتھ ان کی خرید و فروخت کیسے ہوتی تھی؟ اس پر بھی غور کرنا چاہیے وہ تو ہمیشہ بغیر سود کے نظام چلاتے رہے اور بہترین نظام چلاتے رہے۔ ہم دوسروں کے نظام کے محتاج ہو کر رہ گئے کیا اس لیے کہ ان کی زندگیاں بامقصد تھیں۔ وہ آگ تھے جہاں گئے وہاں کفر اور خدا کی نافرمانی کی برف پگھلا کر رکھ دی اور ہم آج بے مقصد زندگی گزارنے کے عادی ہو کر برف بن گئے ہیں اور کفر اور معصیت خداوندی کی آگ ہمارے وجود کو بھاپ میں بدل کر ہوا میں گم کر رہی ہے۔

جناب رسول اللہ ﷺ کی ختم نبوت کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ بس اب قیامت تک پیش آمدہ نئے سے نئے مسائل کا حل اسلام ہی میں ہے۔ زمانہ کتنی ہی کروٹیں بدلے اور حالات کتنے ہی پیچیدہ کیوں نہ ہوں کوئی نئی نبوت نہیں آئے گی، تمام مسائل کا حل حضرت خاتم النبیین ﷺ کی لائی ہوئی اس آخری شریعت ہی میں ملے گا۔ سو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں معیشت کا یا فلاں فلاں نئے پیش آمدہ مسائل کا حل نہیں ہے کیا وہ ایک اعتبار سے ختم نبوت کا بھی انکار نہیں کرتے؟ ان کا کیا خیال ہے کہ العیاذ باللہ اب کوئی نیا نبی آنا چاہیے جو ان مسائل کو حل کرے؟ ابھی تو جناب رسول اللہ ﷺ کے سینکڑوں خدام موجود ہیں جو اس جدید معیشت کے بالمقابل ایک مکمل اور بھرپور نظام اپنے ذہن و قلم میں رکھتے ہیں لیکن اس کا کیا کیجیے کہ

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

ہم اپنے نجی معاملات پر غور کریں تو قرض بلا ضرورت لینا گناہ کبیرہ ہے۔ اس کبیرہ گناہ کا ارتکاب ضروریات اور تعیّشات کے فرق کو پیش نظر نہ رکھنے سے عام ہو گیا ہے۔ شادی، غم، نجی معاملات، نام و نمود اور بیسیوں بے کار کاموں کے لیے قرض لیا جاتا ہے، فرضی ضروریات گھڑی جاتی ہیں اور گناہوں کا بوجھ سر پر لدر رہا ہے مگر پرواہ ہی نہیں۔ دوسری طرف سرمایہ دارانہ ذہنیت کا حال یہ ہے کہ جس نے قرض لیا ہے خواہ وہ مر رہا ہے مگر اسے مہلت نہیں دینی چاہیے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا صاف اور کھلے لفظوں میں یہ حکم ہے کہ:

وان کان ذو عسرة فنظرة الی میسرة وان تصدقوا خیر لکم ان کنتم تعلمون. (پارہ:۳، سورۃ البقرہ، آیت:۲۸۰)	اور اگر تمہارا قرض دار تنگ دست ہے تو اسے ہاتھ کھلنے تک مہلت دو اور اگر تم سرے سے معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھو۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ تو وہ ہستی ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اللہ کی قسم کھا کر یہ

فرمایا تھا۔

والله انی لاحبك[1] — اللہ کی قسم معاذ تجھ سے محبت ہے

ایک مرتبہ ان پر کاروبار کے سلسلے میں بہت زیادہ قرض ہوگیا اور قرض خواہ تنگ کرنے لگے تو جناب رسول اللہ ﷺ نے ان کے دوستوں کو حکم دیا کہ اپنے دوست کے قرض کو ادا کرو۔ سب نے کوشش کی مگر مطلوبہ رقم مہیا نہ ہوسکی تو جناب رسول اللہ ﷺ نے جمع شدہ رقم قرض خواہوں کو دیتے ہوئے فرمایا۔

خزوا ماوجد تم ولیس لکم الاذلك. — یہ رقم تم آپس میں تقسیم کرو اور اس کے علاوہ اب تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔

قرض کے تفصیلی احکامات تو فقہی کتابوں میں دیکھ لئے جائیں مگر ہم متعلقہ آیات واحادیث کی روشنی میں اپنا طرزِ عمل بھی تو دیکھیں کہ کیا کرتے ہیں؟ پھر قرض تو ایک بات ہے، ذہنیت اس قدر سرمایہ دارانہ اور سودی بن گئی ہے کہ اچھے اچھے دیندار حضرات جو نماز، روزہ، حج، ہر سال عمرہ تک کی سعادت سے مشرف ہوتے ہیں کاروبار میں طے یہی کریں گے کہ نفع ونقصان دونوں میں شراکت ہوگی مگر جب نقصان کی اطلاع ملتی ہے تو ایک دن کے لیے برداشت نہیں کر پاتے اور اصل زر کی واپسی کے لیے بھی ایسے شدید تقاضے جیسے زندگی اور موت اسی رقم پر موقوف ہوکر رہ گئی ہے اور اگر نفع ملتا رہا تو برسہا برس تک کوئی پرواہ نہیں۔ سو عملی زندگی میں یہ رویہ کہ نفع پر رضامندی اور نقصان میں شرکت نہ کرنا کیا یہ سودی ذہنیت نہیں ہے؟ اس وقت اسلام کی معاشی تعلیمات عمل کے لیے کیوں سامنے نہیں آتیں؟ اس لیے کہ زندگی بامقصد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہیں اپنے نفس کے ساتھ پرستش کا تعلق ہے۔

ے جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآن نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دیں

---

[1] ابوداؤد۔

کیا تجارت اور معیشت اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ آپ اس میدان میں کام کریں مگر اسے صرف ذریعہ اور واسطہ ہی رکھیں، منزل مقصود نہ بنائیں وہ تو بس صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے ''اللہ تعالیٰ کی خوشی اور رضا''

جہاد: اسلاف کی زندگیاں اس مقدس کام کے لیے وقف تھیں وہ اپنا لہو بہا کر، سر کٹا کر اور جسم تیروں، تلواروں، نیزوں سے داغ داغ کرا کر زمین پر سر فخر سے بلند کر کے آسمان کے ہم پلہ ہو کر چلتے تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنا تھا اس کے لیے جان کا نذرانہ پیش کرنا تو کوئی بات ہی نہ تھی ان کی موت کی دلیل حیاتِ جاوداں اور ان کی قبریں وفائے عہد کے درخشندہ نشاں۔

؎ چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم جو بچا ہے مقتل شہر میں
یہ مزار اہل صفا کے ہیں یہ ہیں اہل صدق کی تربتیں

ان کے مبارک دور میں فوجی اور سیاسی قیادت کا الگ الگ تصور ہی نہ تھا جو حکمران وقت تھا وہی فوج کا سربراہ تھا، جو امیر المؤمنین تھا وہی چیف آف آرمی سٹاف تھا۔ آئندہ آنے والا مورخ جب امت مسلمہ کے زوال کے اسباب مرتب کرے گا تو برصغیر کے بارے میں یہ بھی لکھے گا کہ یہاں انگریزی دور حکومت ہی میں یہ رسم چلی کہ دونوں قیادتیں (سیاسی اور فوجی) الگ الگ ہوئیں وگرنہ دور عروج کی آخری یادگار برصغیر کا مجاہد و آخری تاجدار محی الدین سلطان اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے دور تک قیادت ایک ہی تھی۔ جو خلیفہ تھا سو وہی سالار لشکر تھا۔ جہاد تو اکابر کی گھٹی میں پڑ گیا تھا اور اس نشے میں ایسے مست و سرشار تھے کہ حضرت عبداللہ بن حر رضی اللہ عنہ جو مجاہد تھے اور کئی ایک معرکوں میں شریک رہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں شام میں زمین کا ایک ٹکڑا خرید کر کھیتی باڑی میں مصروف ہو گئے۔ زراعت کوئی برائی نہ تھی جس پر عتاب ہوتا مگر امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جہاد چھوڑ کر زراعت میں لگ جانا اتنا ناگوار گزرا کہ فرمایا:

''بڑے سرمایہ داروں کی گردنوں میں جو ذلت اور حقارت کا طوق تھا، جہاد چھوڑ کر اس طوق کو تم نے اپنے گلے میں ڈال لیا۔''

اور پھران کی زمین ضبط کر لی۔[1]

جہاد میں پسپائی اختیار کرنا اور لوٹ آنا کس قدر شرمندگی کا باعث تھا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غزوہ موتہ میں اگرچہ جنگی حکمت عملی کے تحت مسلمانوں کو ایک جگہ پیچھے ہٹنا پڑا اور جو پیچھے ہٹے وہ شرعاً گنہگار نہ تھے مگر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (جو پیچھے ہٹنے والوں میں سے تھے) فرماتے تھے ایک مرتبہ میری اپنے چچا زاد بھائی سے کچھ بات ہوگئی اور جب معاملہ بڑھا تو اس نے کہا کیا تم وہی نہیں ہو غزوہ موتہ میں پیچھے ہٹ گئے تھے؟ تو اس بات کے جواب میں مجھے سمجھ میں نہیں آئی کہ اسے کیا کہوں[2]؟ آپ اسکے بعد کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں کیا جہاد بھی کبھی اس امت میں ختم ہوا ہے؟ کیا کبھی اسے ختم کرنے کا سوچا جا سکتا ہے؟ اس امت کی آبرو اور بقا کا ضامن جہاد ہی ہے۔ امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے برصغیر میں جب یہ فریضہ عملاً ساقط ہو رہا تھا اس کی تجدید فرمائی اور اسے زندہ کیا۔ بدر سے لے کر بالاکوٹ تک اور غزوہ خیبر سے لے کر معرکہ حطین تک زریں و تابناک تاریخ جن کے اسلاف کی روایت ہو وہ کیسے جہاد کو چھوڑ سکتی ہے؟ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جب مصر فتح کیا تو اپنی فوج اور مجاہدین کو مخاطب کر کے ایک ایسا تاریخی جملہ کہا جو لوح دل پر نقش کر لینے کے قابل ہے۔ ایک مسلمان مجاہد کو ہمیشہ اس جملے کی روشنی میں اپنا جائزہ لینا چاہیے۔ فرمایا۔

''اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ تم ہمیشہ محاذ جنگ پر ہو اور تمہارے چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہیں اور ان کے دل تمہاری تباہی کے خیال سے کبھی غافل نہیں رہتے۔[3]

(باقی آئندہ شمارے میں)

☼......☼......☼

---

[1] الاصابه، ج:۳، ص:۸۸.

[2] ابو نعیم وطبرانی.

[3] ابن اثیر.

نعت رسول مقبول ﷺ

تو مقصدِ تخلیق ہے ، تو حاصلِ ایماں
جو تجھ سے گریزاں ، وہ خدا سے ہے گریزاں

کردار کا یہ حال صداقت ہی صداقت
اخلاق کا یہ رنگ کہ قرآن ہی قرآں

کیا نام ہے' شامل ہے جو تکبیر واذاں میں
اس نام کی عظمت کے ہیں قربان دل وجاں

اشکوں سے ترے' دین کی کھیتی ہوئی سیراب
فاقوں نے ترے' دہر کو بخشا سر و ساماں

انسان کو شائستہ و خوددار بنایا
تہذیب و تمدن ترے شرمندۂ احساں

رحمت کا یہ عالم ہے ، مروت کا یہ انداز
ماؔہر سا گنہگار ہے وابستۂ داماں

(ماہر القادری رحمۃ اللہ علیہ)

(کلیات ماہر،ص:۸۳۳)